مذہبی رواداری اور صوفیائے پنجاب

ارشد منیر لغاری☆
ڈاکٹر غلام علی خان☆☆

Abstract:

"Sufism is the second name of Path, observance and Truth. Sufis declared it as favorite attitudes and characters, and an attitude is in fact, is the name of respect, love, sincerity, tolerance and patience. It is a science whose intend is the compensation of the heart and avert him from all else but Allah. The purpose of the Sufis is to effort towards unity. Their main purpose is to bring humanity, separated as it is into so many different units, closer together in the deeper understanding of life. They always preach and persist to refute oneself and to demolish the ego-self (Nafs) and its worldly needs. Baba Fareed, Baba Bulahy Shah and Shah Hussain are considered some of the most significant Sufi masters in Punjab. They were the beacon of hope and harmony for the people of all faith and creed. Their poems and Kafis are full of love, respect and harmony and thus can be said that their writings symbolize them as a humanist. They made effort to generate welcoming feelings between the different groups of people by harmonizing the differing systems. It is dire need of the time to spread the massages of such sufis and Darvish in the universe which is going to be shattered by the terrorism and extremism."

☆ لیکچرار زرعی کالج ڈیرہ غازی خان ☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبین ﷺ تک اللہ تعالی کی ہدایت کا مرکزی عنوان انسان کی ذات ہے، جبکہ انسان کا مقصد تخلیق رب کائنات کی عبادت ہے۔ارشاد باری تعالی ہے کہ ''**وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**''[۱] عبادت کے لیے ایک اہم عنصر صفائی وطہارتِ قلب ہے، جب تک انسان علائق دنیا سے تعلق توڑ کر خدا کی طرف کامل توجہ نہیں کرے گا، عبادات کی تکمیل نہ ہو پائے گی۔اسی توجہ اور انہماک کا نام تصوف ہے۔لفظ صوفی کا لغوی معنی ''اونی'' اور توسیعی معنی ''اُون پہننے والا (پشمینہ پوش) ہے[۲] اے، جے آربیری کے مطابق:

> "The Sufis were only named sufis because of the Purity of their hearts and the cleanliness of their acts."[3]
> (صوفیہ کو یہ نام صرف ان کے دلوں کی پاکیزگی اور اعمال کی صفائی ستھرائی کی وجہ سے دیا گیا)

حضرت جنید بغدادیؒ سے پوچھا گیا کہ تصوف کیا ہے؟ جواب دیا کہ بُرے اخلاق چھوڑ دینا اور اچھے اخلاق اختیار کر لینا[۴] یہی وجہ ہے کہ ایک صوفی لوگوں پر اپنا بوجھ نہیں ڈالتا، بلکہ ان کی تکالیف اٹھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔کسی کو تکلیف نہیں دیتا، لیکن اگر کوئی دوسرا اسے تکلیف دے تو وہ اسے خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ہر وقت دوسروں کی خیر خواہی میں رہتا ہے اور اپنی جان و مال اور آبرو کو ان کے لیے وقف کئے ہوتا ہے۔[۵] برصغیر پاک و ہند میں صوفیائے دین نے اسلام کی اشاعت میں جو بھرپور کردار ادا کیا اور اصلاح اور ضبط نفس کی تعلیم کے ذریعے اسلام کی جو محبت بھری تصویر پیش کی اور رواداری کا جو اعلیٰ مظاہرہ پیش کیا کہ جس کی بناء پر یہاں کے باسی اپنے آپ کو اسلام کے رنگ میں رنگنے سے باز نہ رکھ سکے اور اسلام کی طرف کھنچے چلے آئے وہ اخلاق حسنہ ہی کی بدولت تھا۔تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ برصغیر میں اسلام کے فروغ میں سب سے زیادہ موثر کردار صوفیاء کرام نے ادا کیا جن کی فکری، علمی اور عملی زندگی نے شاہراہ اسلام کو عوام الناس کے لیے پرکشش بنا دیا اور یوں لوگ جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے۔یہ کارنامہ تلوار کے زور پر نہیں بلکہ فیضان نظر سے ظہور پذیر ہوا، اور بقول ڈاکٹر عبدالمجید سندھی ''مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم و تربیت انہی بزرگان دین کے ذریعے ہوئی، ان کے ذریعے مختلف طبقوں میں اخوت، مساوات، رواداری، صلح جوئی اور امن پسندی پیدا ہوئی، اور صحت مند معاشرہ وجود میں آیا اور امن وسلامتی کی فضا پیدا ہوئی۔''[۶] صوفیا کرام کی مجلسوں میں اپنوں اور غیروں کی یکجائی کا عجب سماں نظر آتا، نہ کسی پر تنقید، نہ کسی پر تعریض۔گفتگو میں نہ مناظرانہ پن اور نہ کسی کی دل آزاری کا شائبہ۔وہی بات کہی جو ہر ایک کے دل کی تھی، کوئی ویران دل لے کر بیٹھا، آباد دل لے کے اٹھا، خالی ہاتھ پہنچا، دامن بھر کر گیا، تھکا ماندہ آیا، ہشاش بشاش رخصت ہوا، صوفیا کی مجلس گویا صحرا کے پیادہ پا مسافروں کے لیے گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی تھی۔[۷] چنانچہ زیر نظر مقالہ میں پنجاب کے ایسے ہی چند عظیم صوفیاء کرام، بابا بُلھے شاہ، خواجہ غلام فرید، شاہ حسین اور

بابا فرید کی ان تعلیمات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جن میں مذہبی رواداری، برداشت اور تعظیم کے ساتھ ساتھ احترام آدمیت کا سبق ملتا ہے۔

تعارف و تعلیم بابا بلھے شاہ

بابا بلھے شاہ اعلیٰ روحانی اقدار کے مالک ایک کامل صوفی درویش ہیں، ان کا اصلی نام عبداللہ شاہ تھا، پھر عبداللہ شاہ سے بُلھے شاہ ہو گیا۔[۸] آپ حقوق انسانی کے علمبردار تصور کئے جاتے ہیں کیونکہ آپ احترام انسانیت کا سبق دیتے ہیں، انسان کی عزت کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں انسان کو اس کی حقیقت سے آشنا کراتے ہوئے، اسے نصیحت کرتے ہیں کہ کمزوروں کو نہ ستایا جائے، تخت و تاج کے لالچ میں اپنے بھائیوں کو قتل نہ کیا جائے، ان کی شاعری میں ذات پات اور فرقہ بندی کی بُو تک نہیں ملتی۔[۹]

آج جس طرح مختلف مذاہب و مسالک میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں جو جھگڑے پیدا ہوئے پڑے ہیں، اور ہر مذہب و مسلک کے لوگ خدا کو پانے اور اسکی معرفت کے حصول کے لیے جن اختلافی راہوں پر چلتے ہوئے، فتنہ و فساد کا سبب بن رہے ہیں، ان کے لیے بابا بلھے شاہ سادہ مگر حقیقی نسخہ تجویز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیوں خوامخوا اپنے لیے خود ہی عذاب پیدا کر لیے گئے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

شہ رگ تھیں رب وسدا نیڑے　　لوکاں پائے لمّے جھیڑے
یاں کے جھگڑے کون نبیڑے　　بھج بھج کے عمر گوائی اے
گل رَولے لوکاں پائی اے[۱۰]

بابا بلھے شاہ کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا میں نیک و بد، امیر و غریب، حاکم و محکوم اور محبت و نفرت حتی کہ دوستی و دشمنی جیسی اصطلاحات تو فقط بہانۂ دنیا ہیں، حقیقت میں تو سب میں خدا ہی کا رنگ ہے۔

کِتے رُومی ہو کِتے زنگی ہو　　کِتے ٹوپی پوش فرنگی ہو
کِتے مئے خانے وچ بھنگی ہو　　کِتے مَہر مہری بن وسدے ہو
کینہوں لامکانی دَسدے او
تُسی ہر رنگ دے وچ وسدے او[۱۱]

کہیں تو رُومی کے روپ میں تو کہیں حبشی کے روپ میں اپنا جلوہ ظاہر کرتا ہے۔ کہیں تو مہر و محبت بن کر رحمت کا سایہ کر دیتا ہے تو کسی کو لامکان ہونے کا بتا رہا ہے، جبکہ ہر رنگ میں تو ہی بستا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بابا بلھے شاہ عشق حقیقی کی راہ پر چلتا نظر آتا ہے، ایسی راہ کہ جو معشوق کو چھوٹی چھوٹی پابندیوں سے آزاد کرا کر عاشق کو عشق کی حقیقی اور اصلی منزل تک پہنچا دیتی ہے،

ملاں قاضی راہ بتاون، دین دَھرم دے پھیرے
ایہہ تاں ٹھگ جگت دے جھیور، لاون جال چوپھیرے

کَرَم شرع دے دَھرَم بتاون، سنگل پاون پیریں
ذات مذہب ایہہ عشق نہ پُچھدا، عشق شرع دا ویری (۱۲)

بابا بلھے شاہ کے نزدیک اگر دنیا میں سکھ چین اور امن ومحبت جیسے باغ و بہار کی خواہش ہو تو اس کے لیے قلندری کی دنیا بسائی جائے، جس نے بھی قلندرانہ راز پالیا، اس نے اپنے من کو خود ہی صراط مستقیم پر چلا دیا، اور جس من نے بھی یہ راہ اپنالی، وہ سکھ چین کی زندگی بسر کرے گا، دنیا کے جھگڑوں سے بے نیاز ہو جائے گا، کیونکہ یہ ایسا راستہ ہے کہ جہاں مساوات ہی مساوت ہے، اُونچ نیچ اور اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی چکر نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

جس پایا بھیت قلندر دا　　راہ کھوجیا اپنے اندر دا
اوہ واسی ہے سکھ مندر دا　　جتھے کوئی نہ چڑھدی لہندی (۱۳)

اور یہ قلندرانہ راز دراصل عشق حقیقی ہے، جس کے ملنے پر انسان لسانیت، علاقائیت اور مسلکیت جیسے اختلافات سے آزاد ہو جاتا ہے۔

جاں میں سبق عشق دا پڑھیا　　مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکر دے وڑیا　　جتھے وجدے ناد ہزار
عشق دی نویوں نویں بہار

تعارف وتعلیم خواجہ غلام فرید

آپ کا نام غلام فرید ہے جبکہ تاریخی نام خورشید عالم ہے۔ آپ ۱۲۶۱ھ بمطابق ۱۸۴۵ء کو چاچڑاں شریف میں پیدا ہوئے، جبکہ ۲۷ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا فخر الدین کی وفات کے بعد سجادہ نشین بنے۔ اس موقعہ پر نواب صادق محمد خان عباسی نے آپ کی دستار بندی کی رسم ادا کی۔ آپ کے پردادا مخدوم محمد شریف کے ایک مرید مٹھن خان بلوچ نے مٹھن کوٹ آباد کیا تھا۔ خواجہ غلام فرید کے والد گرامی خواجہ خدا بخش نے مٹھن کوٹ سے خرابی حالات کے باعث چاچڑاں شریف نقل مکانی کی تھی جبکہ خواجہ غلام فرید نے اپنے دور میں واپس آکر مٹھن کوٹ میں سکونت اختیار کی۔

خواجہ صاحب کو ہفت زبان شاعر کہا جاتا ہے۔ ان کی شخصیت متنوع صفات کی حامل تھی۔ وہ ایک معروف شاعر، جید عالم دین اور صاحب حال صوفی تھے۔ جنہوں نے صوفیانہ ادب کو بھی ایک نیا رنگ بخشا۔ وہ ایک صناع کی مانند الفاظ کو نگینوں میں جڑتے ہیں۔ اندازِ بیان کی بے ساختگی نے خلوص جذبہ کے ساتھ مل کر کافیوں میں بے پناہ تاثیر کا جادو جگایا ہے۔ خواجہ صاحب ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اور آپ کا شمار باعمل صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپ کی وفات ۷ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ بمطابق ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء بروز جمعرات ہوئی اور آپ کو مٹھن کوٹ (ضلع راجن پور، پنجاب، پاکستان) میں سپرد خاک کیا گیا۔

خواجہ صاحب کے نزدیک انسان کا وجود عالمگیر ہے اور وہ محدودیت کے تحت زندگی نہیں گزار

سکتا۔عمرانی اعتبار سے وحدت الوجود کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ فکر مختلف مذاہب ،عقائد اور مسالک کی بناء پر انسانی معاشرہ کو منشر کرنے کی بجائے اسے ایک وسیع تر وحدت میں خم کرنے پر زور دیتی ہے،ایسی وحدت کہ جس میں فرقہ وارانہ امتیاز کی کوئی جگہ نہیں۔یہ رویہ وحدت الوجود کے بنیادی عقیدے کی پیداوار ہے جو صوفی کو کثرت میں بھٹکنے کی بجائے صرف ذات احدیت کی تلاش پر مائل کرتا ہے۔اس طرح صوفی انسانی معاشرے میں محبت ،امن اور یکجہتی کا پیامبر بن کر آتا ہے اور انسانی تہذیب کو نفرت، جنگ،خونریزی اور مخاصمت کی جہنم سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔خواجہ صاحب کے کلام میں یہ پیغام عام ملتا ہے کہ انسان کو بالآخر ایسا بن جانا چاہئے کہ وہ ساری دنیا کے لیے امن وآشتی کا پیامبر بن جائے۔ آپ ہمیشہ فرماتے تھے کہ مظلوم کی آہ سے بچو،ان کے لیے آسانیاں پیدا کرو،ان کے ساتھ نرمی برتو اور ان کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھو،اور وہ بھی کسی رنگ ونسل اور مذہب ومسلک کے جھگڑوں میں پڑے بغیر۔چونکہ تمام صورتیں تو اسی محبوب حقیقی کی ہیں،تو جب تمام صورتوں میں وہی ذات پنہاں ہے،تو پھر ظلم وزیادتی وحق تلفی کس کے ساتھ ہو،جب اس طرح کی سوچ،اس طرح کی فکر اور یہی تعلیمات ہوں گی تو پھر کون سنگ دل ہوگا جو کسی کا ناحق خون بہائے گا،کسی کا حق مارے گا،کسی کی جائیداد پر ناجائز قابض ہوگا،جو کسی کو دھوکہ دہی کا شکار بنائے گا،یا پھر وہ کون ہوگا جو کسی کی عزت وناموس کو داغ دار کرے گا،نہیں بالکل نہیں،ان تعلیمات کے ہوتے ہوئے ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔(۱۴)

خواجہ صاحب مخلوق خدا کی تکریم وتعظیم کے قائل ہیں،انسانوں سے بلا رنگ ونسل اور مذہب و نظریات، پیار ومحبت کا اظہار کرتے ہیں۔مساوات انسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے گویا ہیں کہ:

سب صورت وچ ذات سُنجانی　　حق باجھوں بیو غیر نہ جانی
سوہنا کوجھا صرف بہانہ　　ہکڑو ہئی ول سمجھ سنجانی(۱۵)

مطلب یہ کہ چونکہ سب کا خالق اور مالک ایک ہی ہے اور سب کی تخلیق میں نفس واحد کا عنصر ہے،اسی لیے تمام صورتوں میں ایک ہی ذات کو پہچانا جائے،اسی طرح حق چونکہ واضح ہے،اس لیے حق کے علاوہ کسی غیر حق کو نہ پہچانا جائے،جہاں تک کالے وگورے اور خوبصورت وبدصورت کا تعلق ہے تو تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ شکل وصورت اور رنگ تو صرف ایک بہانہ ہے،ورنہ تو ہر صورت وحدہ لاشریک ذات کی تخلیق کردہ ہے۔احترام آدمیت اور تعمیر انسانیت کا خوبصورت فلسفہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

قبلہ ، کعبہ ، مسجد ، مندر　　دَیر کِنش سب تجھ میں ہے
صوم صلوٰۃ کے خود ہو والی　　کیوں پابند گماں کے ہو(۱۶)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

کیوں توں فرد تے جز سڈانویں ، توں کلی توں کل
باغ بہشت دا توں ہیں مالک ، خود بلبل خود گل

عرش وی تیڈا ، فرش وی تیڈا ، توں عالی ان مُل
دنیا ، عقبیٰ ، برزخ اندر ، ناہیں تیڈڑا تُل
یار فریدا کول ہے تیڈے ، ناں بے ہودہ رُل(۱۷)

خواجہ غلام فرید ایک باعمل صوفی تھے، آپ لوگوں کو جو نصیحت فرماتے، خود بھی اس پر عمل پیرا ہوتے، یہی وجہ ہے کہ احترام آدم اور مقام آدم کا درج بالا تصور نہ صرف یہ کہ ان کی شاعری میں ملتا ہے، بلکہ ان کی اپنی زندگی بھی اس تعلیم کی عملی مثال دکھائی دیتی ہے، اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔ ایک مرتبہ ریاست جھل مگسی (بلوچستان) کے فرمانروا نواب قیصر خان مگسی نے آپ کی خدمت میں ''ناز پری'' نامی ایک گھوڑی بھجوائی، ریاست کا ایک معروف چور ''نندو خان'' اس گھوڑی کو بہت پسند کرتا تھا، جب اُسے اطلاع ملی کہ گھوڑی خواجہ غلام فرید کو تحفے میں بھجوائی جا رہی ہے تو اس نے گھوڑی کو چُرانے کا فیصلہ کیا۔ جب گھوڑی جھل مگسی سے روانہ کی گئی تو یہ بھی اس کے پیچھے ہولیا، تاکہ راستے میں موقع پاتے ہی اپنا کام کر لے۔ لیکن وہ راستے میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، یہاں تک کہ گھوڑی خواجہ صاحب تک پہنچ گئی۔ رات کو جب گھوڑی خواجہ صاحب کے اصطبل میں باندھی گئی تو نندو خان نے اسے چرانے کی کوشش کی، جس میں وہ ناکام رہا اور گرفتار کر لیا گیا۔ صبح اُسے خواجہ صاحب کے روبرو پیش کیا گیا۔ خواجہ صاحب نے وجہ دریافت کی تو چور نے بتایا کہ اسے وہ گھوڑی بہت پسند تھی، چنانچہ وہ اس کے لیے پیدل سفر کرتا ہوا یہاں تک آیا تاکہ اسے چُرا سکے، حضرت خواجہ نے اسے کہا کہ اگر تم اس پر سواری کر سکتے ہو تو لے جاؤ، یہ گھوڑی تمہاری ہے، چور بڑا خوش ہو کر گھوڑی پر سوار ہوا، آدھے گھنٹے تک کوشش کرتا رہا کہ گھوڑی منزل کی طرف چلے، لیکن گھوڑی چلنے کا نام ہی نہ لیتی۔ آخر کار وہ چور گھوڑی واپس خواجہ صاحب کے پاس ہی لے آیا اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ آپ نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا کہ نندو خان ایسے کام تو تمہیں جچتے ہی نہیں، آپ کی نظر کرم کا یہ اثر ہوا کہ نہ صرف نندو خان نے توبہ کی بلکہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ساری زندگی آپ کے قدموں میں بسر کر دی اور وفات بھی کوٹ مٹھن میں ہوئی۔(۱۸) سید ارتضیٰ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ آپ اپنے عقیدت مندوں کو اخلاق، رحمدلی اور صلح جوئی کی تلقین فرماتے تھے، اور عملی نمونے بھی پیش کرتے تھے۔(۱۹)

آپ نہ صرف خود مذہبی ہم آہنگی کے قائل ہیں، بلکہ آپ کی شاعری میں مذہبی رواداری اور برداشت کا سبق بالکل واضح اور شفاف ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

سمجھ، سُنجانی غیر نہ جاڑنی — سبھ صُورَت ہے عین ظہور
رَکھ تصدیق نہ تھی آوارہ — کَعبہ، قبلہ، دَیر، دُوارہ
مسجد، مندر ہِکڑو نور(۲۰)

اے سالک! یہ خوب سمجھ لے کہ دنیا کی ہر ایک صورت میں خالق عالم کی قدرت کا جلوہ موجود

ہے۔اس لیے کسی چیز کو اس کی حدود وقدرت سے غیر نہ جاننا (سمجھ لینا اور پہچان لینا اور کسی کو غیر نہ سمجھنا، ہر صورت اور شکل عین ظہور ہے)۔اے سالک! اس بات کی تصدیق رکھ اور آوارہ نہ بن جا کہ کعبہ، قبلہ، بت خانہ اور دوارہ، مسجد اور مندر میں ایک ہی نور کی تلاش کی جاتی ہے۔ یہ صوفیانہ گیت جن کا سادہ اور عام فہم مفہوم یہی ہے کہ یہ گیت احترام انسانیت، رواداری، برداشت اور تحمل کا درس دیتے ہیں۔ جسے عصر حاضر میں ہم لوگ جمہوریت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔یعنی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ۔(۲۱)

مذہبی نفرت اور تشدد کے خاتمے کے لیے نہ صرف مسلکی ہم آہنگی کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ عالمی اور بین الاقوامی مذہبی رواداری کا درس دے کر فرد اور معاشرہ میں سکون کے پیامبر بن جاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

بدھ مجوس ، یہود نصاریٰ ہندو تے دیندار
آکھن پاک منزّہ ہے بے اَنت اَلکھ اُپار(۲۲)

بُدھ مذھب کے پیروکار ہوں یا آتش پرست، یہودی یا عیسائی ہوں، ہندو ہوں یا دیندار مسلمان، سب اس ذات پاک کی تقدیس کرتے ہیں، کیونکہ وہ پاک اور بے عیب ہے، بے ابتداء اور بے انتہا ہے، ماورائے علم وعقل ہے اور لامحدود ہے۔

اسی طرح مختلف انبیاء کی تعریف اور ان کے سچا ہونے کا ذکر کر کے جہاں اپنے عقیدے کو مضبوط کرتے نظر آتے ہیں وہاں دوسرے الفاظ میں ان کے مذاہب کے احترام کا درس دے رہے ہوتے ہیں۔فرماتے ہیں:

ہے عشق دا جلوہ ہر ہر جا سبحان اللہ! سبحان اللہ!
کڈیں موسیٰ تھی میقات چڑھے ول وعظ کرے توریت پڑھے
کڈیں عیسیٰ ، یحییٰ ، زکریا سبحان اللہ! سبحان اللہ!(۲۳)

یعنی ہر جگہ عشق کا جلوہ ہے، کبھی موسیٰؑ کی صورت میں یہ عشق میقات پر کلامِ الٰہی سے شرف یاب ہوتا ہے، تو کبھی توریت کا درس دیتا ہے، کبھی یہ عشق عیسیٰ بن جاتا ہے، کبھی یحییٰ اور کبھی زکریا کی صورت میں آجاتا ہے، سبحان اللہ!

اسی بات کو ایک اور کافی میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

بن دلبر شکل جہان آیا ہر صورت عین عیان آیا
کتھے آدمؑ کتھے شیثؑ نبی کتھے نوحؑ کتھے طوفان آیا
کتھے ابراہیمؑ خلیل نبی کتھے یوسف وچ کنعان آیا
کتھے عیسیٰ تے الیاسؑ نبی کتھے لچھمن رام تے کان آیا
کتھے زکریاؑ کتھے یحییٰؑ ہے کتھے موسیٰؑ بن عمران آیا(۲۴)

خواجہ صاحب کے بارے کرنل اقبال کے الفاظ ملاحظہ کریں:

''آج کی بدامنی، دہشت گردی اور مادہ پرستی کے دور میں خواجہ فریدؒ کے امن، پیار و محبت کے پیغام کو پوری دنیا میں عام کرنے کی ضرورت ہے، اگر ہمارے ادارے اور اکابرین یہ کام کردیں تو یہ بات نہ صرف امن عالم کے لیے مفید ہوگی بلکہ سرائیکی قوم کے لیے بھی عزت وتوقیر کا باعث بنے گی۔ (۲۵)

تعارف وتعلیم شاہ حسینؒ

شاہ حسین جو عام طور پر مادھولال حسین کے نام سے معروف ہیں، لاہور کے ایک معروف درویش ہوگزرے ہیں۔ یہ ۹۴۵ھ بمطابق ۱۵۳۸ء میں پیدا ہوئے، جبکہ وفات ۱۰۰۸ھ بمطابق ۱۵۹۹ء لاہور ہی میں ہوئی (۲۶) دس سالوں میں قرآن مجید حفظ کیا، بعدازاں ۳۶ سال کی عمر تک مولوی محمد ابوبکر، شیخ بہلول اور داتا گنج بخش جیسی ہستیوں سے راہنمائی پاتے رہے، مشہور واقعہ ہے کہ ۹۸۱ھ میں آپ شیخ سعداللہ سے جب قرآن کی تفسیر پڑھ رہے تھے اور جب ''**وما الحیوۃ الدنیا الا لھو و لعب**'' پر پہنچے تو اپنے استاد سے اس کا مطلب پوچھا، جس سے آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ زندگانی ایک کھیل تماشہ ہی تو ہے۔ بس یہاں سے ہی آپ ایک عالم فاضل کے بجائے مست و رند بن گئے، اور رقص وسرور کرتے ہوئے مدرسے سے باہر چلے گئے۔ آپ نے طالبِ علموں کے ہاتھوں سے تفسیر کی کتاب چھینتے ہوئے اسے کنویں میں پھینک دیا۔ طلباء کے شور مچانے پر خود ہی کنویں سے کتاب ایسے نکالتے ہیں کہ وہ ذرہ بھر بھی گیلی نہیں ہوتی۔ آپ اپنی داڑھی مونچھیں صاف کرا کر لال رنگ کا لباس پہنتے ہوئے ناچتے اور شراب پیتے نظر آتے ہیں۔ دن کو آپ یہ کام کرتے ہیں اور رات کو ہمیشہ دریائے راوی میں کھڑے ہوکر قرآن پاک پڑھتے ہیں۔ یہی سلسلہ تمام عمر جاری وساری رہتا ہے۔ (۲۷) شاہ حسین کو ۵۶ سال کی عمر میں شاہدرہ کے ایک ۱۸ سالہ برہمن لڑکے ''مادھولال'' سے محبت ہوگئی، جس کی بناء پر آپ نے اس کا اور اپنا نام ملاتے ہوئے مادھولال حسین اپنا نام رکھ لیا اور اسی نام سے مشہور ومعروف ہوئے۔

آپ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے، لیکن آپ کا زیادہ تر کلام اور کافیاں پنجابی زبان میں ہیں، جو کہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے ہر گھر میں بڑے شوق اور احترام سے سنی اور گائی جاتی ہیں۔ آپ نے شاعری کو صرف حق کی تبلیغ کے لیے ہی اپنایا اور پوری انسانیت کو امن وآشتی، صلح ومحبت اور پیار واخلاق کی تعلیمات دیں۔

بقول سلیم اختر ''شاہ حسین کے کلام کے کلا بے انسان کی حقیقت اور انسان کے اگلے پڑاؤ سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے فکر وفن کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی، شاہ حسین نے پنجابی ادب کو کافی روشناس کرایا، ان کو کلاسیکل دور کا دوسرا بڑا شاعر کہا جاتا ہے، ان کے کلام میں امن وآشتی، صلح ومحبت، پیار واخلاق اور انسانیت کی رہنمائی ہے، انھوں نے حق اور سچ کا بول بالا کیا ہے اور اپنے عارفانہ کلام کے

ذریعے محبت کا پیغام دیا ہے۔ان کی تعلیمات اخلاقیات کا درس دیتی ہیں۔[۲۸] ایک مرتبہ کسی شخص نے شاہ حسین سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ تو انہوں نے درج ذیل کافی کے ذریعے جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

اَنی حُسَینو جُلاہا، نہ اِس مول نوں لاہا
نہ اوہ منگیا نہ اوہ پَرنایا نہ اوس گنڈھ نہ ساہا
نہ گھر باری،نہ مسافر نہ اوہ مومن ،نہ او کافر
جو آہا سو آہا[۲۹]

یعنی میں وہی شاہ حسین جُلاہا ہوں، جسے نہ تو کبھی فائدہ ہوا اور نہ ہی نقصان۔نہ اسکی منگنی ہوئی اور نہ ہی اسے بیاہا گیا۔اس نے نہ تو کوئی گھر بار بنایا،اور نہ وہ مسافر بن پایا۔نہ ہی وہ مومن بنا اور نہ ہی وہ کافر ٹھہرا۔وہ جو کچھ بھی تھا ٹھیک تھا۔

شاہ حسین نہ صرف دنیا کو حقیر سمجھتے ہیں بلکہ بے نیازی کی انتہا کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی سب سے کم تر اور کم حیثیت تصور کرتے ہیں،اس نظریے کی بدولت جہاں وہ ایک طرف ضبط نفس کا کام لیتے ہیں وہاں دنیا والوں کو بھی یہ پیغام دیتے ہیں کہ جب انسان کی کوئی حیثیت اور وقعت ہے ہی نہیں،تو پھر یہ انا،تکبر یا دوسرے لفظوں میں فتنہ وفساد کی ضرورت ہی کیا ہے،اس صورت میں تو عاجزی وانکساری یعنی محبت واحترام ہی زندگی کا مقصد حیات ہونا چاہیے۔

حسینو! کس باغ دی مولی
باغاں دے وِچ چنبا مروا ، میں بھی وچ گندھولی
کُوڑی دنیا ، کُوڑا مانا ، بُھلی دنیا پھر دی پھولی
چھوڑ تکبر ، پکڑ حلیمی ، شاہ حسین پائے سمجھولی[۳۰]

شاہ حسین لڑائی جھگڑوں اور دشمنیوں اور نفرتوں کے خلاف ہیں ،ان کے نزدیک دنیا سفر آخرت کی تیاری کے لیے ہے،ایسے غلط امور میں وقت ضائع کرنے سے اصل مقصد سے نہ صرف توجہ ہٹ جاتی ہے بلکہ مقصد ہی پورا نہیں ہو پاتا۔سو ایک انسان سے لے کر پورے سماج تک کو دشمنی سے زیادہ دوستی،نفرت سے زیادہ محبت اور جنگ سے زیادہ امن کا خواہاں اور متلاشی ہونا چاہیے،اسی پیغام کو وہ اس کافی میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دِینہوں لتھا ای ہرٹ نہ گیرنی
سئیاں نال گھر ونج سویرے ، کُوڑے جھیڑ نہ جھیڑنی
اکناں بھریا اک بھر گئیاں ، اِکناں نوں پئی اوریرنی
پچھوں وی پچھتاسیں کڑیئے ، جدوں پوسی آ گھمن گھیرنی
کہے حسین فقیر سائیں دا ، ایتھے وت نہیں آونا پھیرنی[۳۱]

ایک اور کافی میں اسی پیغام کی مزید وضاحت کرتے ہے کہتے ہیں کہ:

دنیا جیون چار دیہاڑے،کون کسے نال رُسے
جیں ول ونجاں، موت تنے ول،جیون کوئی نہ دسے (۳۲)

یعنی جب دنیا کی زندگی ہے ہی چار دن کی،تو پھر کیوں کسی سے ناراض ہوا جائے یا کیوں کسی کو ناراض کیا جائے۔اب تو حالت یہ ہے کہ ہر طرف موت ہی موت نظر آ رہی ہے،زندگی کا سفر تو جیسے ختم ہی ہوا چاہتا ہے،کیونکہ جس سے بھی پوچھا جائے،وہ زندگی کا راستہ بتا ہی نہیں پا رہا۔

تعارف وتعلیم بابا فرید گنج شکر

بابا فرید گنج شکر جن کا پورا نام فرید الدین مسعود اور لقب گنج شکر ہے،اپنے وقت کے عظیم صوفی، عالم اور مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ پنجابی شاعری کے بانی شمار ہوتے ہیں۔آپ کی پیدائش ۱۱۸۸ء میں ملتان کے ایک مضافاتی موضع کوٹھیوال میں ہوئی جبکہ وفات ۱۲۸۰ء میں پاک پتن میں ہوئی۔(۳۳) مورخین آپ کے لقب ''گنج شکر'' کے حوالے سے کئی وجوہات بتاتے ہیں،جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک روز آپ کی ملاقات کچھ تاجروں سے ہوئی جو اونٹوں پر چینی کے تھیلے لیے جا رہے تھے۔بابا فرید نے پوچھا کہ یہ کیا لے کر جا رہے ہو؟ تاجروں نے سوچا کہ کہیں یہ درویش شکر کا مطالبہ نہ کر دے،اس لیے از راہ مذاق کہا کہ نمک لے کر جا رہے ہیں۔کہتے ہیں کہ چینی اسی وقت نمک بن گئی۔تاجروں نے منزل پر پہنچ کر بوریوں میں نمک ہی نمک دیکھا تو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے فوراً بابا فرید کے پاس واپس آ کر توبہ کی۔ آپ نے انہیں سچائی کی تلقین کی اور اخلاقی تعلیم سے نوازا اور پوچھا کہ تھیلوں میں کیا لے کر جا رہے تھے؟ انہوں نے کہا کہ شکر۔آپ نے فرمایا تو پھر شکر ہی ہو گی،اور اس طرح وہ نمک پھر سے شکر بن گیا۔یہ خبر منڈی کے ذریعہ دور دراز علاقوں میں تیزی سے پھیلی اور لوگ انہیں گنج شکر (شیرینی کا خزانہ) کہہ کر پکارنے لگے۔(۳۴)

بابا فرید کی ابتدائی تعلیم وتربیت ان کی والدہ قرسوم بی بی کے ذریعے ہوئی جبکہ روحانی فیض و برکات کے ساتھ ساتھ راہ سلوک کی منازل اپنے مرشد حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ اور سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت اور صحبت میں رہ کر طے کیں۔آپ کے شاگردوں میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا،حضرت علاء الدین موج دریا اور جلال الدین ہانسوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ہندوستان کے بادشاہ غیاث الدین بلبن آپ کے سُسر ہیں۔

بابا فرید کی تعلیمات میں اخلاقیات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ایک ایسے ملک اور ماحول میں کہ جہاں مختلف مسالک و مذاہب اور رسوم و رواج کی حامل اقوام موجود ہوں،وہاں آپ کا اخلاقی نظام ایک ایسی مشترکہ قدر بن جاتا ہے کہ جس پر کسی خاص مذہب ونظریے کی چھاپ نہیں ہوتی،جس کی بنا ء پر وہ ہر شخص کے لیے موزوں قرار پاتے ہوئے پُرکشش بن جاتا ہے۔

سید افضل حیدر کے بقول ''آپ نے انسانی رشتوں کا بڑا احترام کیا اور ہر شخص سے محبت کا اظہار کر کے اس کے دکھ درد بانٹنے کا بیڑا اٹھایا، آپ عدم تشدد کے حامی تھے، رواداری، پیار، محبت، انکساری، عجز، کشادہ دلی آپ کا منشور بن گیا۔ اپنے ملنے والوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری کا سبق دیتے، بُرائی کا بدلہ نیکی سے دو، غصہ تھوک دو، دلوں کو رنجشوں سے پاک کر دو، تمہارا جسم کدورتوں سے پاک ہو جائے گا اور زندگی آسان ہو جائے گی۔(۳۵)

یہی وجہ ہے کہ بابا جی کی تعلیمات میں جگہ جگہ تکریم انسانیت اور تعظیم انسان کا درس ملتا ہے۔ آپ کو مخلوق خدا کے نقصان کا کسی بھی معاملے پر شائبہ بھی گزرتا تو آپ اس کا قلع قمع فرما دیتے، ایک دفعہ اجودھن میں ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آہستہ سے آپ کے کان میں کہا کہ دہلی میں ہم دونوں ہم سبق تھے۔ اس کے کہنے کا دراصل مقصد یہ تھا کہ اس کو شہر میں قاضی یا مفتی کی جگہ مل جائے، آپ نے اس کی نیت کا پتہ نور باطن سے لگا لیا، اور فرمایا کہ بھائی اگر پڑھنے کا مقصد جنگ و جدال ہے تو مت پڑھو، اگر عمل کے لیے ہے تو اس قدر علم کافی ہے کہ پڑھو اور اس پر عمل کرو، شریعت کے علم کے پڑھنے سے مقصود اس پر عمل کرنا ہے نہ کہ خدا کی مخلوق کو تکلیف پہنچانا ہے۔(۳۶)

ایک مرتبہ ایک حملہ آور کہ جس نے چمڑے کا لباس اور کان میں بالی پہنی ہوئی تھی، آپ کو مارنا چاہا۔ آپ اس وقت سجدے کی حالت میں تھے، جونہی اس نے حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے کہا کہ میں نے اسے معاف کر دیا، وہ آپ کے یہ الفاظ سن کر اتنا لرزہ براندام ہوا کہ آپ کو قتل کئے بغیر ہی بھاگ گیا۔(۳۷)

خلاصۂ کلام

یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندوستان میں اسلامی تصوف کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ مساوات، اخوت اور محبت کی عملی تعلیمات تھیں اور یہی وہ سب کچھ تھا جس کی ہندوستان کے پسے اور بکھرے ہوئے طبقات کو ضرورت تھی۔ آج، جبکہ دنیا میں عقائد اور ازم سے لے کر مذاہب اور مسالک کی بھرمار نظر آتی ہے، جو انسانی کامیابی کے لیے تگ و دو میں مصروف ہیں، اسی طرح سائنسی اور علمی سیڑھیوں نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے یقینی اور عدم اطمینان کی کیفیت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ لوگ غموں سے دل گرفتہ اور دکھوں سے آزردہ ہیں۔ انسان، انسانوں کی دنیا ہی میں تنہا اور ہر مادی آسائش کے باوجود ناآسودہ ہے۔ آج کے مذہبی انتہا پسندانہ اور فرقہ وارانہ ماحول میں ضرورت ہے کہ روشن قلب و نظر کی حامل ایسی ہستیوں کے افکار و نظریات کو عام کیا جائے جن کے علم و عمل نے ماضی میں بھی لوگوں کی زندگیوں کو تبدیل کر دیا اور آج بھی ان کی انسان دوستی اور محبت و اخوت پر مبنی تعلیمات معاشروں اور قوموں کو گمراہی سے نکال کر روشنی کا سامان پیدا کر سکتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ الذاریات ۵۶
۲۔ مارٹن لنگز، تصوف کیا ہے، مترجم، چودھری صفدر علی، عرفان اکادمی، فیصل آباد: ۱۹۸۳، باب ۵ (القلب) ص ۴۴
3. Arberry, A. J, The Doctrine of the Sufis, New York: Cambridge University Press, P:5
۴۔ ابن جوزی، گم راہ صوفی، مترجم، ملیح آبادی، مطبوعہ ہند پریس، کلکتہ: سن ندارد، ص ۵
۵۔ ابن قیم، طریق الھجرتین وباب السعادتین، مترجم مولانا عبدالرحیم، الہلال بک ایجنسی، لاہور: سن ندارد، ص ۱۳۱
۶۔ سندھی، عبدالمجید، پاکستان میں صوفیانہ تحریکیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: ۲۰۰۰ء، ص ۳۰
۷۔ گیلانی، خورشید احمد، سید، روح تصوف، فرید بک سٹال، لاہور: ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۰
۸۔ سلیم اختر، تیرے عشق نچایا، انتخاب کلام بابا بلھے شاہ، بک ہوم، لاہور: ۲۰۱۰ء، ص ۹
۹۔ پنجابی، ارشاد احمد، بُلھے شاہ کی سوچ، پنجابی ادبی لہر، لاہور: ۱۹۸۲ء، ص، ۲۵ تا ۲۸
۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۹
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۴
۱۲۔ ایضاً، ص ۴۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۳
۱۴۔ ایضاً، ص ۹۹
۱۵۔ فریدی، میاں محمد اختر، سلطان العاشقین کی انسان دوستی، روز نامہ جنگ، ملتان: اشاعت خاص، مورخہ ۲۵ اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۵
۱۶۔ ہاشمی، پروفیسر حمید اللہ، میڈا عشق وی توں، شرح کلام حضرت خواجہ غلام فرید، مکتبہ دانیال، لاہور: ۲۰۰۱ء، کافی نمبر ۲۶۸
۱۷۔ کافی نمبر ۲۲۶
۱۸۔ کافی نمبر ۱۴۷
۱۹۔ کافی نمبر ۷۶
۲۰۔ فریدی، مولانا نور احمد، حضرت خواجہ غلام فرید، حالات زندگی، جھوک پبلشرز، ملتان: ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۔۲۰
۲۱۔ کرمانی، سید ارتضی علی، پیر، کلام خواجہ غلام فرید، عظیم اینڈ سنز، لاہور: ۲۰۰۳ء، ص ۳

۲۲۔ کافی نمبر۵۰

۲۳۔ ہاشمی، پروفیسر حمید اللہ، میڈا عشق وی توں، شرح کلام حضرت خواجہ غلام فرید، مکتبہ دانیال، لاہور: ۲۰۰۱ء، ص۱۲۹

۲۴۔ کافی نمبر۵۳

۲۵۔ کافی نمبر۱۵۵

۲۶۔ کافی نمبر۰۳

۲۷۔ ملک، محمد اقبال، کرنل، کوٹ مٹھن داگھوٹ: حضرت خواجہ غلام فریدؒ، جھوک پبلشرز، ملتان: ۲۰۰۹ء، ص۲۲

۲۸۔ چشتی، نور محمد، تحقیقات چشتی، پنجابی اکیڈمی، لاہور: ۱۹۶۴ء، ص۳۶۴

۲۹۔ مقبول، میاں ظفر، کلام شاہ حسین، مکتبہ دانیال، لاہور: ۱۹۹۹ء، ص۱۶

۳۰۔ سلیم اختر، مائے نی میں کنہوں آکھاں، بک ہوم، لاہور: ۲۰۱۰ء، ص۱۵

۳۱۔ مقبول، میاں ظفر، کلام شاہ حسین، مکتبہ دانیال، لاہور: ۱۹۹۹ء، کافی نمبر۱۶۳، ص۲۱۲

۳۲۔ ایضاً، کافی نمبر۱۵۳

۳۳۔ ایضاً، کافی نمبر۱۳۲

۳۴۔ ایضاً، کافی نمبر۱۷

۳۵۔ حسرت، محمد یونس، پروفیسر، کلام بابا فرید گنج شکر، بک ہوم، لاہور: ۲۰۱۰ء، ص۱۷

۳۶۔ سید افضل حیدر، زندگی نامہ بابا فرید گنج شکر، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد: ۲۰۰۲ء، ص۴۴

۳۷۔ ایضاً، ص۲۶